تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کا منہاج

ڈاکٹر وحید عشرت

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ---- حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی فکریات میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ خطبات لاہور' مدراس' حیدر آباد اور علی گڑھ میں دیے اور ساتواں خطبہ "کیا مذہب کا امکان ہے؟" لندن کی ارسطاطالین سوسائٹی کی دعوت پر لکھا۔ پہلے کتاب میں چھ لیکچر تھے جبکہ ساتواں خطبہ بعد میں شامل کیا گیا۔ ان خطبات کی دو خوبیاں بڑی واضح ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ یہ خطبات برصغیر پاک و ہند کے مشرقی اور مغربی دونوں علوم پر گہری نظر رکھنے والی ایک ممتاز علمی شخصیت نے دیے جس کا اپنے عہد میں بھی اور بعد میں بھی بجا طور پر احترام موجود ہے۔ ان خطبات میں اسلام اور عالم اسلام کو تمدنی اور تہذیبی سطح پر اپنی بقا اور احیا کے لیے در پیش سوالات کا جواب فراہم کرنے کی سعی کی گئی۔ میں زیادہ مفصل بات کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہوئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ انیسویں صدی میں مختلف علوم کے حاصلات' جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے ثمرات نے مذہب اور بالخصوص اسلام کو جو مبارزتیں دیں' ان سے مذہب کا وجود معرض خطر میں محسوس ہو رہا تھا اور بجا طور پر یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ انسان کے داخلی پہلوؤں کے باہمی ربط اور فرد اور اجتماع کے درمیان تعلقات کی اساس کیا ہے' اور اس ضمن میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔ پھر انہی علوم کے حاصلات سے سائنس کے بارے میں اور مادے کے حوالے سے جو پرانے معتقدات شکست و ریخت کا شکار ہو رہے تھے' ان سے بھی مذہب کے اثبات کی دلیل تلاش کرنے کی ضرورت ابھر رہی تھی۔ علامہ اقبال نے بروقت اس شعور کا ابلاغ پایا اور ان خطبات کے ذریعے ان سوالات کو منتشکل کیا اور ان کے جوابات فراہم کیے۔ برعظیم ہی کی نہیں' مسلم دنیا کی موجودہ علمی روایت میں یہ ایک بہت بڑا معرکہ تھا جو اقبال نے سرانجام دیا' اور اقبال جیسا تبحر علمی رکھنے والا شخص ہی اس کے لیے موزوں تھا۔

علامہ اقبال کے ان خطبات کی دوسری اہمیت' علامہ کی زبان کی سنجیدگی' ان کا علمی طرز استدلال اور مفکرانہ شان ہے جس میں وہ مسئلے کی تہ تک اترنے اور اس کو پورے شعور کے ساتھ ابلاغ دینے کی سعی کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی زبان و بیان میں پوری مغربی اور مشرقی روایت علم کا شعور اس وقت نمایاں نظر آتا ہے جب وہ اپنی نقد و نظر میں قدیم مفکرین اور جدید فلاسفہ' ماہرین تاریخ و تہذیب اور نفسیات دانوں وغیرہ پر بات کرتے ہیں۔ یوں یہ خطبات تاریخ فکر انسانی کے ایک وسیع کینوس اور بڑے تناظر میں بیان ہوئے ہیں' لہٰذا اس بات کی بڑی گنجائش موجود ہے کہ

ان خطبات پر اپنی بصیرت اور استطاعت کے مطابق بات کی جائے۔
میرا ذاتی خیال ہے کہ علامہ اقبال کے خطبات پر ابھی کوئی بڑا کام کھل کر سامنے نہیں آیا' جبکہ ان کی شاعری پر خاصا کام موجود ہے۔ پھر ان پر جو کام میری نظر سے گزرا ہے وہ تشریحی اور توضیحی نوعیت کا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے خطبات کو مصر کے شعبہ فلسفہ کے محمد البہی کی طرح سرے ہی سے مسترد کر دیا ہے۔ اس کے برعکس مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اپنی کتاب "خطبات اقبال پر ایک نظر" میں اسے ایک نئے مسلم علم الکلام سے تعبیر کیا ہے۔ محمد شریف بقا' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' پروفیسر محمد عثمان اور شعبہ اقبالیات کی کتاب تسہیل خطبات اقبال کا میں اس لیے ذکر نہیں کر رہا کہ یہ کتب خطبات اقبال پر کسی نقد کے بجائے ان کی توضیح و تشریح کے ذیل میں زیادہ آتی ہیں۔
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ----- میری نظر میں اپنے منہاج کے حوالے سے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ مذہب اور فلسفہ یا سائنس میں تطابقت پذیری' Reconciliation کی صدیوں پرانی روایت کا تسلسل ہے اور روایت کا آغاز یہودی فلسفی فلو سے ہوا جس نے یہودیت اور فلسفے کی تطبیق کی سب سے پہلی کوشش کی۔ اس روایت کو فلو کے ہم وطن' اسکندریہ کے عیسائی فلسفی فلاطینوس نے فلسفے اور مذہب میں تطبیق کے ذریعے پروان چڑھایا۔ یونانی اور رومی تہذیب کی بربادی کے بعد جب مسلمانوں کو عروج ہوا اور مسلمانوں کے دارالحکومت بغداد کو مسلمانوں کے ذہنی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں اور دیگر تہذیبوں مثلاً فتح ایران کے بعد مجوسی اور ایرانی معتقدات' مصر کی فتح سے رومی اور یونانی تصورات اور اسی طرح شام اور ترکی وغیرہ کی فتح سے غیر تہذیبوں سے مسلمانوں کا واسطہ پڑا' اور اس سے بھی پہلے جب مسلمانوں' یہودیوں اور عیسائیوں کا آپس میں ملاپ ہوا تو اسلام کی سادہ' دلنشیں اور علمی تعلیمات کو نئے نئے سوالات اور صورت احوال سے سابقہ پڑا۔ اسکندریہ کی فتح سے وہاں کی علمی فضا اور لائبریریوں سے علوم کا سیلاب یہ نکلا تو وہ تمام سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جو یہودی اور عیسائی علم الکلام میں زیر بحث تھے۔ مسلمانوں کی حکومت کے پھیلاؤ کے ساتھ حکومت' انتظامیات' زبان' لباس' نشست و برخاست اور تہذیب و تمدن کے متعدد الٰہیاتی اور کلامی مسائل پیدا ہوئے۔ مسلمانوں نے اور ان کے زیر اثر عیسائی اور یہودی اسکالروں نے ان کتب کو عربی میں ترجمہ کیا تو جبریہ' قدریہ اور معتزلہ اور اشاعرہ کے حوالے سے جو منہاج فکر مسلمانوں میں پروان چڑھا' وہ مذہب اور فلسفے اور سائنس کے درمیان تطبیق کا تھا جو فلاطینوس کے ہاں پہلے سے مروج تھا۔ فلاطینوس کو چونکہ ارسطوئے ثانی بھی کہا جاتا تھا اور مسلمانوں کے ہاں یونانی فلسفہ اس کے توسط سے آیا تھا اور ایک طویل عرصے تک بعض مسلمانوں سکالر افلاطون اور فلاطینوس میں امتیاز نہ کر سکے تھے' لہٰذا پوری مسلم فکریات پر فلاطینوس کا اثر نہایت گہرا تھا اور اس کے فکر اور منہاج فکر سے مسلمان کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اولین فلسفی ابویعقوب الکندی سے الفارابی' ابن سینا اور ابن عربی تک فلاطینوس کا اثر ناقابل بیان حد تک گہرا ہے۔ افلاطون کا نظریہء امثال' عیون اور نظریہء صدور کی ادلی بدلی صورتوں میں

فلاطینوس کے ذریعے مسلمانوں میں حرکت کرتا رہا ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ خود اقبال کے تصور خدا اور تصور کائنات میں اس تفکر کی بازگشت موجود ہے۔

فلسفے اور مذہب' اور سائنس اور مذہب میں تطبیق کی جو روایت مسلمانوں میں الکندی' الفارابی' ابن سینا' ابن عربی' امام غزالی اور ابن رشد کے ذریعے تقویت پاکر پروان چڑھی' اس کو 1857ء میں ہمارے زوال کے بعد مسلم احیاء پرستی کے تصور کے تحت سرسید احمد خان نے اپنایا۔ سرسید احمد خان کا اسلامی علوم کا کسی حد تک مطالعہ تھا لیکن مغربی علوم پر ان کی کوئی دسترس نہ تھی۔ سرسید کے دور میں یورپی ذہن اور تفکر کا واضح رجحان نیچرل ازم کی طرف تھا۔ سرسید نے جب یورپی اور مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر مذہب کی فطرت (نیچر) سے تطبیق کی روش اختیار کی اور مذہبی معتقدات کو جب فطرت اور قوانین فطرت کے حوالے سے دیکھا تو انہوں نے معجزات اور بعض اور اہم اور واضح مذہبی معتقدات کی مضحکہ خیز توجیہات شروع کیں جس کی وجہ سے وہ نیچری کہلائے' اور مذہب کے حوالے سے ان کے خیالات کو قبول نہ کیا گیا۔ سرسید کی مذہب' فلسفے اور شاعری میں اس نیچرل ازم کی تحریک کے نتیجے میں حالی اور مولانا آزاد کا وہ دلبستان شاعری وجود میں آیا جس نے شاعری اور ادب میں فطرت پرستی' قدرتی مناظر اور وطن پرستی کو رواج دیا۔

سرسید احمد خان سے زیادہ محتاط' فلسفیانہ اور علمی انداز میں ہی سہی' علامہ اقبال نے بھی اپنے عہد کے سائنس اور فلسفیانہ حاصلات سے مذہب کی تطبیق اور تصدیق کا کام لیا جو بجائے خود ایک مفاہمانہ اور مصالحانہ سرا گمندگی کی چغلی کھاتا ہے اور اس کا مقصد سادہ ترین الفاظ میں مذہب کا ایک معذرت خواہانہ دفاع ہے۔ اقبال کا سارا طرز مخلصت یوں ہے کہ جدید سائنس' طبیعیات' کیمیا اور دیگر علوم کے حاصلات مذہب کے نظریات اور بنیادی تصورات کا اثبات کر رہے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سائنس اور فلسفے اور دیگر علوم کے حاصلات مذہب کی تصدیق کر رہے ہیں تو ہمیں قابل قبول ہیں اور ہم ان کی تصدیقات کو مذہب کے لیے حجت تسلیم کرتے ہیں لیکن اگر کل کلاں سائنس اور فلسفہ کے یہی نظریات بدل جائیں' وہ اپنی خود تردید کر دیں تو کیا مذہب کے ان معتقدات کو ہم رد کر دیں گے جو پچھلی بار مصدقہ قرار پائے تھے' کیا ہم نئے حاصلات سائنس اور فلسفے کو باطل قرار دیں گے یا پھر مذہب کے معتقدات کی ان کے مطابق توجیہ و تعبیر کریں گے اور پھر مذہب اور سائنس میں تطبیق کی نئی کوششیں کریں گے۔ ایسی صورت میں مذہب کی بار بار تطبیقات کے بعد جو ہیئت کذائی سامنے آئے گی' اس سے مذہب کیا رہ جائے گا؟ پھر ہم کیوں ہر نئے آنے والے سائنسی نتیجے کو قطعی اور اٹل اور حتمی سمجھ لیتے ہیں' محض اس لیے کہ وہ قابل تصدیق ہیں؟ کیا ضروری ہے کہ سائنس کے تمام نتائج اور حاصلات درست' حتمی اور قطعی ہوں؟ اپنے اس طرز عمل سے دوسری جو بات ہم ثابت کرتے ہیں' وہ یہ ہے کہ مذہب پانی کی طرح کوئی بے رنگ اور بے بو چیز ہے جسے جس برتن میں ڈالا جائے ویسا ہی رنگ اور شکل اختیار کر لیتا ہے' اس کی اپنی کوئی حتمی اور قطعی شناخت نہیں۔

اس سارے عمل کی وجہ جو مجھے نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ سائنس اور مادے سے متعلق

علوم میں اضافہ، ترقی اور ارتقا کا ایک واضح عمل موجود ہے۔ اس کا گراف عمودی ہے جو نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے، جبکہ مذہب کے معتقدات میں ارتقا کا یہ عمل مفقود ہے، اور وہ روز اول کی طرح اٹل ہیں، حتمی اور قطعی ہیں۔ ہم ایک ارتقا پذیر چیز سے متاثر ہوتے ہیں اور اٹل، حتمی اور قطعی چیز میں ہمیں جمود نظر آتا ہے، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ہمیں حتمی، قطعی اور اٹل معتقدات اور حقائق کی اساس پر فلسفے، سائنس اور مادے سے متعلق علوم کو پرکھنا چاہیے۔ یہی کام ہے جو مسلمانوں نے کبھی نہیں کیا۔ قرآن کی اساس پر علوم و فنون کو نہیں پرکھا بلکہ قرآن ہی کو تاویل کے ذریعے پاژند بنانے کا آج تک عمل ہوتا رہا ہے۔ اقبال جس نے قرآن میں غوطہ زنی کی اور یہ کہا کہ اگر قرآن کے علاوہ انہوں نے اپنی تعلیمات میں کچھ پیش کیا ہو تو انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بوسہ پا نصیب نہ ہو، وہ بھی خطبات میں اس واضح شعور سے محروم رہے اور انہوں نے قرآن کو اساس بنانے کے بجائے خود قرآن کی نفسیات، طبیعیات اور دیگر علوم سے تصدیق چاہنے کا طریق منہاج اپنایا جو قطعی طور پر غیر قرآنی اور غیر اسلامی تھا اور صدیوں سے مسلمان فلاسفہ، اہل علم اور محققین نے یہی اپنا رکھا ہے۔

میرے نزدیک مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ فلسفے، سائنس یا کسی اور نظام سے مذہب کی تطابقت پذیری نہیں اور نہ مذہب کے لیے فلسفے، سائنس یا کسی ایسے معتقدات اور نظام کی تصدیق کی ضرورت ہے۔ قرآن نے جس چیز کو حکمت کہا ہے، مسلمانوں کے ہاں وہ نمو پذیر نہیں ہو سکی۔ اس کی جگہ مسلمانوں میں یہودی اور مسیحی علم الکلام کے حوالے سے مسلم علم الکلام کا لایعنی اور بیہودہ طومار اکٹھا ہو گیا کہ اس سے قرآن کی اپنی روح حکمت کجلا گئی اور خود قرآن کے معتقدات اور مضامین تشکیک کی نذر ہو گئے۔ مسلمانوں نے اسلام کی اپنی اساس حکمت پر اپنا کوئی تمدن برپا کرنے کے بجائے دوسروں کے حاصلات پر اپنے لیبل چپکا کر اسے اسلامی بنانے کا فن ایجاد کیا، مثلاً طب یونانی پر اسلامی کا لیبل لگا کر طب اسلامی بنانے کا فن ایجاد کیا۔ اور اس کی انتہا شہنشاہوں، جاگیر داروں اور اہل ثروت کے لیے قوت باہ تیز کرنے کے نسخے تیار کرنے پر منتج ہوئی۔ اس میں کوئی تحقیقی اور علمی پیش رفت نہ ہو سکی۔ چنانچہ یہ مغرب کی طب کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہی ہے۔ اب تو معجونوں میں حکمانے انگریزی ادویات پیس کر ملا لی ہیں اور اسی پر ان کا گزارا ہے۔ یہ خیال آج تک کسی کو نہیں آیا کہ قرآن اور احادیث میں مختلف چیزوں کے خواص اور انسانی جسم کی ساخت اور نشو و نما کے حوالے سے جو کچھ موجود ہے، اس کو دیکھیں کہ کیا کوئی نظام طب وجود میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ بات بہت لمبی ہو جائے گی، بہرحال مختصراً" میرا کہنا یہ ہے کہ خطبات، اقبال کے گہرے تفکر کے آئینہ دار ہیں اور ان کو پچاس سال گزرنے کے بعد مزید گہرے تدبر کے ساتھ کھنگالنا چاہیے کیونکہ پہلے دو خطبات میں مذہب کے امکان کے لیے اقبال نے علم کی اساس مذہبی مشاہدے یا مذہبی تجربے پر رکھی ہے اور اسے اسی طرح سائنس کہا ہے جس طرح کہ کوئی اور سائنسی تجربہ ہو سکتا ہے مگر اقبال ان خطبات میں خود مذہبی مشاہدہ قابل ابلاغ ثابت نہیں کر سکے۔ جب مذہبی واردات قابل ابلاغ ہی نہیں تو کسی علم کی اساس کیونکر بن سکتی ہے۔ ناقابل

ابلاغ مذہبی تجربہ جب علوم کی اساس فراہم نہیں کر سکتا تو وہ کسی تہذیب اور تمدن کی بنیاد بھی فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال کا امکان مذہب کسی تمدن' تہذیب اور کلچر کی پرداخت نہیں کرتا۔ یوں خطبات میں اقبال کا تصور علم اور مذہب دونوں مبہم' غیر سائنسی اور غیر علمی توجیہات سے عبارت نظر آتے ہیں اور اقبال کی مذہب کی تشکیل نو کی خواہش ایک معصومانہ خواہش اور اذعانیت سے زیادہ کوئی معنی نہیں پاتی۔ اب پروفیسر وائٹ ہیڈ کی مذہب کی تعریف جس کا اقبال نے اپنے پہلے خطبہ میں حوالہ دیا ہے کہ مذہب عام حقائق کا وہ نظام ہے جسے اگر خلوص سے مانا اور جیسا کہ اس کا حق ہے سمجھ لیا جائے تو اس سے سیرت اور کردار بدل جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اقبال وائٹ ہیڈ کی اس مذہب کی تعریف کو درست طور پر سمجھ بھی پائے ہیں یا نہیں کیونکہ حقائق کے کسی بھی نظام کو اگر کوئی شخص بغیر غور و فکر اور سوچ بچار کے محض خوش عقیدگی سے مان لے تو اس کے انسانی سیرت و کردار پر اثرات کا مرتب ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ یہ مذہب سے کوئی مخصوص بات نہیں' کمیونسٹوں نے مارکس کی تھیوری اور معاشی نظریات کو حقائق کے ایک نظام کے طور پر قبول کیا اور اس کے اثرات بھی ظاہر و باہر ہیں۔ اب اس پر ہم مذہب کا اطلاق کس طرح کریں۔ بعض فسطائی نظام قبول کر لیے جاتے ہیں اور وہ اپنے مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کیا انہیں مذہب تسلیم کر لیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ وائٹ ہیڈ کی مذہب کی یہ تعریف کوئی استدلالی نہیں اور نہ یہ نتائجی رویے اثبات مذہب کے لیے کوئی کسوٹی ہیں۔ اگر ایک رسول تمام عمر تبلیغ کرنے کے بعد ایک بھی شخص کو خدا کی حقانیت پر قائل نہ کر سکے اور اپنے نظریات کے مثبت نتائج پیدا نہ کر سکے تو نعوذباللہ کیا ہم اسے اقبال کی نتائجیت کے حوالے سے باطل قرار دے دیں گے۔ نتائجیت کا مذہب پر اطلاق بجائے خود ایک مغالطہ ہے جو اقبال نے مذہب کی صداقت کا معیار بنا ڈالا۔ اب اقبال جب خود ہی وائٹ ہیڈ کے حوالے سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مذہب کا ہر عہد عقلیت کا عہد ہوتا ہے تو وہ عقل محض کی حقیقت مطلقہ تک رسائی کو کیوں ناممکن قرار دے کر ایمان کو ایک صوفی کے قول کے مطابق ایک پرند کی طرح کہتے ہیں جو اپنا بے نشان راستہ خود دیکھ لیتا ہے۔ اقبال جب مذہب میں احساس کے ساتھ تعقل کا عنصر تسلیم کرتے ہیں تو پھر ایمان کو عقل سے محروم ایک ایسے پرند سے تشبیہ دینا جو محض اپنی جبلت کے سہارے اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہے' ایمان کو کم تر سطح پر لے جانا ہے کیونکہ جبلت حیوانی صفت ہے اور عقل انسانی وصف ہے۔ عقل ہی ایمان کی اساس ہے۔ انسانی معتقدات اور مذہب کا پورا نظام عقل کے بغیر نہ تو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کوئی محکم اساس قائم کی جا سکتی ہے' البتہ عقل کی مختلف سطحیں اور درجات ضرور ہیں۔ ایک بچے کی عقل اور سقراط کی عقل میں فرق ضرور ہے۔ ایک نبی اور رسول کی عقل جو نور الٰہی سے مستنیر ہوتی ہے' ایک عام آدمی کی عقل سے مختلف ضرور ہے۔ ایمان پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہم کسی حقیقت کا اپنے پورے شعور اور ادراک کے ساتھ ابلاغ پاتے ہیں۔ ایک عام آدمی کے ایمان' ایک پیغمبر اور ایک عالم کے ایمان کے درجات کا بھی امتیاز قائم کیا جانا چاہیے۔ لہٰذا اقبال کا عقل کو قابل گردن زدنی کہنا مذہب کی کوئی خدمت نہیں کیونکہ جو کمٹ منٹ ہمارے اندر

عقل پیدا کرتی ہے' وہ اور کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی' اور یہی کمٹ منٹ ایمان کی اساس بنتی ہے۔ تاریخ میں اس کی ایک واضح مثال سقراط ہے جس کا علم اور دانائی' کمٹ منٹ شوکران زہر' پینے کے خوف سے بھی متزلزل نہ ہوئی۔

اپنے خطبے علم اور مذہبی مشاہدات میں صوفیانہ مشاہدات کے لیے اقبال نے جو خصوصیات بیان کی ہیں' وہ یہ ہیں:۔ 1- صوفیانہ مشاہدات کی حضوریت 2- صوفیانہ مشاہدات کی ناقابل تجزیہ کلیت 3- صوفی کا حال ایک لمحہ ہے کسی ایسی فرد وحید اور یکتاہستی سے گہرے اتحاد کا جو اس کی ذات سے ماورا مگر اس کے باوجود اس پر محیط ہو۔ 4- صوفیانہ مشاہدات براہ راست تجربے میں آتے ہیں' لہٰذا ان مشاہدات کو دوسروں تک جوں کا توں پہنچانا ناممکن ہوتا ہے۔ 5- صوفیانہ احوال تادیر قائم نہیں رہتے۔ نبی کی صوفیانہ مشاہدے سے بازگشت سے دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں جبکہ صوفی کی بازگشت ذاتی اور نجی ہوتی ہے۔ یہ خواص جو اقبال نے صوفیانہ تجربے کے بیان کیے ہیں' ان سے صوفیانہ تجربہ مبہم' نجی' ذاتی اور ناقابل ابلاغ قرار پاتا ہے۔ نبی کے مذہبی مشاہدے سے اقبال جن دور رس نتائج کا ذکر کرتے ہیں' وہ بھی قطعی اور درست نہیں کیونکہ ہر نبی کا مذہبی اور باطنی تجربہ نتائج کے اعتبار سے دور رس نہیں رہا۔ لہٰذا مذہبی تجربہ ناقابل ابلاغ ہے اور یہ اساس علم فراہم نہیں کرتا۔ یہ کسی بڑے اجتماعی' تہذیبی اور تمدنی انقلاب کی بنیاد بھی نہیں بن سکتا۔ اقبال کو علم کی اساس کسی نبی یا صوفی کے مذہبی تجربے یا مشاہدے پر رکھنے کے بجائے قرآن پر رکھنی چاہیے تھی کہ صرف وہی حرف خدا اور کلام اللہ ہے اور وہ ایک ایسا فریم ورک فراہم کرتا ہے جو انسان کو ایک اجتماعی نظام حیات سے ہر زمان میں اصول اور اساس میں رہنمائی دیتا ہے۔ مذہبی تجربہ صرف انفرادی عمل ہے اور یہ صرف اپنی ذات اور نفس کے عرفان ... کی اساس بن سکتا ہے' اس سے کسی تمدن اور کلچر یا اجتماعیت کی تخریج ممکن نہیں۔ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی تجربہ نہیں بلکہ یہ خدا کا کلام اور امراللہ ہے جو خدا نے انسان کا مقدر کیا۔ اقبال مذہبی مشاہدے سے علم کی معروضیت کو واضح نہیں کر سکے۔ مذہبی مشاہدہ برکلے کے بقول ہمیں علم کی تفہیم تک تو لے جا سکتا ہے جو علم کی تخلیق و تخریج نہیں کر سکتا۔ علم تو خدا نے آدم کو خود سکھایا' قرآن تو امر ربی ہے جو ہمیں ایک ایسا فریم ورک فراہم کرتا ہے جس سے ہم اپنے احوال و عوالم کی تفہیم اور اس کے حوالے سے اپنے لیے ہر دور اور احوال میں ایک نظام حیات تشکیل کر سکتے ہیں' مذہبی مشاہدہ ہماری ذات کی وحدت اور روحانی بالیدگی کی اساس ضرور ہے مگر علم کی اساس اور پورے نظام حیات کی تشکیل کی بنیاد صرف امر ربی یعنی قرآن پر ہی رکھی جا سکتی ہے' اور وہ ہمارے لیے حکم ہے۔ مذہبی مشاہدات کو اگر علم کی اساس بنا دیا گیا تو اس سے قرآن کی اولیت پر زد پڑے گی اور ہر شخص اپنے مذہبی مشاہدے کو دوسروں کے لیے حکم بنانے پر اصرار کرے گا جو خود ایک خطرناک باب کھولنے کے مترادف ہے۔

مذہبی مشاہدے کے باب میں امام غزالی کا نام بھی بڑا محترم ہے۔ امام غزالی نے "تہافتہ الفلاسفہ اور المنقذ من الضلال" میں فلاسفہ کی مذمت اور اہانت کی ہے اور فلسفے پر شدید قسم

کے اعتراضات وارد کیے ہیں۔ بلا شبہ امام غزالی اسلامی تاریخ ہی نہیں' دنیا کی علمی اور عقلی تاریخ میں بھی ایک سربلند نام ہے اور ان کے افکار و نظریات میں بڑا ٹیلنٹ ہے۔ امام غزالی پر بہت کام کی ضرورت ہے' مگر غزالی جن کدالوں سے فلسفے کی اساس پر اور اس کے جسم و جان پر حملہ آور ہوتے ہیں' وہ کوئی زیادہ موثر نہیں' اس لیے کہ اگر غزالی کی نظر میں فلسفے کے حاصلات اور اس کے طریق کار پر تشکیک کو وارد کیا جا سکتا ہے تو جو اعتراضات وہ فلسفے پر کرتے ہیں' وہی اگر ان کے تصوف اور مذہبی تجربے پر وارد کر دیے جائیں تو امام غزالی کے پاس کوئی راستہ فرار کا نہیں' کیونکہ امام غزالی کا صوفیانہ تجربہ ذاتی' انفرادی' موضوعی اور ناقابل ابلاغ ہونے کی بنا پر اساسیات علم فراہم کرنے سے از خود قاصر ہے۔ امام غزالی نے فلسفے پر اعتراضات کے بعد جب خود کوئی راہ نہ پائی تو انہوں نے کوئی نیا فکری منہاج دینے اور کوئی نظام متشکل کرنے کے بجائے خود تصوف اور صوفیانہ واردات میں پناہ لی' اور یوں علم کی دنیا میں ایک بڑا عالم اور نام' نتیجہ خیزی ثابت کرنے کے بجائے مزید کنفیوژن کا باعث بنا اور فلسفے اور منطق پر ان کے اعتراضات صرف اعتراضات ہی رہ گئے جو مسلمانوں میں تو فلسفے کی پرداخت کی روک کا باعث بنے مگر کوئی نئی حکمت اور بصیرت اس میں سے نہ پھوٹ سکی جسے ہم قرآن کی حکمت کہہ سکیں یا قرآن کے منہاج پر ہم کسی نئے نظام حیات کی اس سے نوید پا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کو بڑی خوبصورتی سے حفظ کیا' اس کی زبان اور لسانی تشکیلات کے بارے میں تحقیق کی' اسے نہایت احترام سے جزدانوں میں سجایا' آنکھوں سے لگایا' اس کے تراجم کیے' حواشی اور تفاسیر اور تشریحات لکھیں' اسے مختلف رسم الخط میں لکھا اور چھاپا' مگر اس کے بے پناہ احترام اور تقدس کے پیش نظر اس کے منہاج' اس کے اسلوب اور اس کے مضامین کا گہرے فلسفیانہ مطالعے کے ساتھ تنقیدی جائزہ نہیں لیا' اس کے مضامین کا فکری' منطقی' سائنسی اور انتقادی سطح پر تجزیہ نہیں کیا بلکہ ہر فکر اور تحقیق کو اور ہر غیر از قرآن تحقیق کو سائنسی اور علمی مان کر فوراً قرآن میں غوطہ زن ہو کر وہ کوئی نہ کوئی آیت اس کی تائید میں بڑی مہارت سے نکال لائے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر قرآن موجودہ دور کی تمام سائنسی تحقیق' حاصلات اور حقائق کو رد کرتا ہے تو ہم قرآن کی تاویل کرنے کے بجائے قرآن کے اس استرداد کو کیوں قبول نہیں کرتے اور قرآن کے اپنے نظام کو حکم بنا کر ایک نئے منہاج تحقیق' ایک نئے سائنسی انداز تخلیق اور ایک نئے نظام فکر کو وجود میں کیوں نہیں لاتے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور مضامین کی نسبت سائنس اور فلسفے کے نظریات زیادہ متحرک' رواں اور ارتقاپذیر ہیں۔ مجھے یہ اعتراض قبول نہیں۔ اگر ہم قرآن کی اساس پر کوئی نظام فکر تشکیل دینے میں کامیاب ہوتے تو وہ بھی اپنے اجتہادی رویوں کی بنا پر از خود ارتقاپذیر رہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا قرآن پر ایمان الفاظ اور زبان کی حد تک ہے' اندر سے اور فکری اور نظری سطح پر ہم سائنس اور فلسفے کے حاصلات پر زیادہ ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ ہمیں مادی دنیا میں دو اور دو چار کی طرح قابل تصدیق نظر آتے ہیں' جبکہ مذہبی حقائق کے بارے میں ہمارے پاس قرآن کے سوا کوئی کسوٹی نہیں' اور انسان کا ذہن مابعد الطبیعیاتی حقیقت کی نسبت

طبیعیاتی حقیقت کو زیادہ آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ اگر ہم نے بھی قرآن کی مابعد الطبیعیات پر سائنسی تحقیق اور علم کی کوئی اپنی طبیعیات منشکل کی ہوتی تو آج دنیا کی ذہنی اور فکری قیادت ہمارے ہاتھ ہوتی اور ہم مغرب سے مسخر ہونے کے بجائے اسے مسخر کر چکے ہوتے۔ میرا استدلال یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیائے علم میں امام غزالی' ابن' خلدون اور ابن تیمیہ کے حوالے سے اس سمت ایک مریل سی آواز تو ابھرتی رہی ہے مگر قرآن کے حوالے سے اتنا بڑا منہاج علم کسی نے منشکل نہیں کیا' اور اقبال جو مغرب و مشرق کے علوم پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے' وہ بھی اپنے شاعرانہ کردار کی بنا پر اس بڑے کارنامے کو انجام دینے کا حوصلہ نہ کر سکے اور پرانے گھسے پٹے منہاج پر ہی سوچنے کو محدود کر بیٹھے۔ چنانچہ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کہ جدید مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کی ہی توسیع ہے' ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی تہذیب کے اپنے کوئی قرآنی تشخصات نہ تھے بلکہ وہ یونانی' رومی اور ایرانی اور برصغیر میں ہندی تہذیب کا ہی اسلامی ایڈیشن تھی جس پر مسلمانوں نے ہمیشہ سبز غلاف چڑھائے رکھا' حالانکہ ہم قرآن کی اساس پر دنیا میں ایک نئی تہذیب' ایک نئے تمدن اور ایک نئے نظریہ ء حیات کے تشکیل دہندہ بن سکتے تھے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبات کے دیباچے میں فرمایا ہے کہ ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکر انسانی کے نشو و نما پر بہ احتیاط نظر رکھیں اور اس بات میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں تاکہ خطبات میں پیش کیے گئے نظریات سے بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں کیونکہ انسانی علم کے مختلف شعبوں میں جو ترقیات رونما ہو رہی ہیں' ان سے مذہب اور سائنس میں نئی نئی ہم آہنگیوں کا انکشاف جو ابھی ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے' شاید آئندہ ظاہر ہو۔ علامہ اقبال کا یہ فقرہ خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کی تمام تر جستجو کا محور' مذہب اور سائنس میں ہم آہنگی کی تلاش رہا ہے' جبکہ میں مذہب کے بارے میں اقبال کے اس معذرت خواہانہ رویے کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے نزدیک مذہب خود ایک حقیقت ہے' سائنس ہر لحظہ تبدیل ہو جانے والے حقائق کا سلسلہ ہے' لہٰذا مذہب کو موم کی ناک کی طرح سائنس کے ہر انکشاف کی طرف نہیں موڑا جا سکتا۔ ہمیں مذہب اور قرآن کا مطالعہ اس کے اپنے منہاج اور اس کے اپنے تناظر میں کرنا چاہیے اور پھر دیکھنا چاہیے کہ مادی دنیا کے حقائق کو ان حقائق سے کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ خطبات پر ہر خطبے کے حوالے سے ہماری آئندہ تنقید اسی بنیاد پر ہو گی تاکہ ہم کسی صحیح منہاج علم کی طرف اپنے قدم اٹھانے کے لیے رہنمائی پا سکیں اور قرآن کے انقلاب پرور پیغام کو درست سمت پر بڑھا سکیں۔